جی چاہتا ہے نقشِ قدم چومتے چلیں

مولانا محمد الیاس احمد کاندھلویؒ

خان یاسر

امی، ابّی اور دادا کے نام

جن سے میں نے سیکھا کہ
عظیم شخصیات
آسمان سے نہیں اترتیں
بلکہ
زمین پر پیدا ہوتی ہیں،
زمین سے وابستہ ہوتی ہیں؛
اور یہ کہ
ہر بچہ
اگر 'چاہے'
تو 'بڑا' آدمی بن سکتا ہے...

دنیا یہ دکھی ہے پھر بھی مگر، تھک کر ہی سہی سو جاتی ہے
تیرے ہی مقدر میں اے دل، کیوں چین نہیں آرام نہیں

”اسلام کیا ہے؟ حال کا جو حکم ہو اس کے آگے گردن رکھنا۔ شیطان ہمیں حال کے حکم کی پابندی سے روکتا ہے۔ شیطان دو قسم کے حجابات ہماری آنکھوں کے سامنے کر دیتا ہے۔ ایک تو ظلمانی حجاب یعنی نفس کو برے کاموں کی حلاوت دے کر ان کے کرنے پر لگا دیتا ہے اور ایک نورانی حجاب؛ نورانی حجاب یہ ہے کہ ایک افضل کام سے ہٹا کر کم اہم کام پر لگا دیتا ہے۔ فرض کے وقت میں نوافل میں مشغول کر دیتا ہے اور نفس یہ سمجھتا ہے کہ میں تو اچھا کام کر رہا ہوں، حال کا سب سے بڑا فریضہ تبلیغ ہے اور اس میں کوتاہی کا بدل بڑی سے بڑی عبادت بھی نہیں ہو سکتی۔[۱۳]“

(محمد الیاس احمد کاندھلوی)

محمد الیاس احمد کاندھلوی

پیدائش اور بچپن: محمد الیاس کی ولادت 1885 میں ایک دینی و علمی گھرانے میں ہوئی، ایسے گھرانے میں جس میں مرد تو مرد عورتیں تک حفاظ تھیں۔ افرادِ خانہ کو دینی کتب و تسبیح و اذکار سے ہی شغف تھا۔ بچوں کو طوطے مینا کے قصوں کے بدلے صحابہ کے ولولہ انگیز واقعات سنائے جاتے۔ محمد الیاس نے بھی مکتبی تعلیم حاصل کی اور خاندان کے دستور کے مطابق قرآن حفظ کیا۔ دینی حمیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی چنانچہ ان کے ایک ہم مکتب دوست بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مولوی الیاس ایک لکڑی لے کر ان کے پاس آئے اور کہا کہ چلو بے نمازیوں کے خلاف جہاد کرتے ہیں۔ ان کا بچپن اپنے ننھیال کاندھلہ یا والد بزرگوار کے پاس نظام الدین میں گزرا۔ 7-1896 میں اپنے بڑے بھائی مولانا محمد یحییٰ کے ساتھ گنگوہ آ گئے جہاں باقاعدہ دروس سے زیادہ انھوں نے صالح اور روحانی صحبتوں سے استفادہ کیا۔ مولانا رشید احمد گنگوہی سے بھی تعلقات استوار ہوئے، آنجناب کسی بھی نوعمر سے بیعت نہیں کرتے تھے لیکن محمد الیاس نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر ان سے بیعت کا شرف حاصل کر لیا۔ شروع سے ہی نحیف اور لاغر تھے، قیامِ گنگوہ کے دوران صحت اور گر گئی۔ دردِ سر کا ایسا دورہ پڑا کہ سر کو جنبش دینا تک محال ہو گیا۔ حکیم نے پانی سے پرہیز کی ہدایت کی اور وائے رے صبر و استقامت! اس بچے نے کامل تیرہ برس تک برائے نام پانی پر گزارا کیا۔ شدید علالت اور کمزوری کے سبب تعلیمی سلسلہ بھی رک گیا۔ آپ پڑھائی دوبارہ شروع کرنے پر مصر تھے مگر اعزہ اس کے خلاف تھے آخر ایک روز بھائی نے پوچھ ہی لیا کہ پڑھ کر کیا کرو گے؟ سعادتمند الیاس نے کمال برجستگی کے ساتھ جواباً سوال کیا ''جی کر کیا کروں گا؟'' اسی اصرار کی بدولت تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔

1908 میں وہ شیخ الہند مولانا محمود حسن کے حلقۂ درس میں شرکت کے لیے دیوبند گئے اور ترمذی اور بخاری کی سماعت کی۔ گو آپ گھر میں سب سے چھوٹے تھے لیکن نہ صرف خاندان بلکہ اکابر کی نگاہ میں

بھی عزت وتوقیر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے شاید یہی وجہ تھی کہ معمر بزرگوں کی موجودگی میں بھی آپ ہی کو نمازوں میں امامت کے لیے آگے کر دیا جاتا تھا۔ رسمی تعلیم کی تکمیل کے بعد 1920 میں **مظاہر العلوم** سہارنپور میں بطور مدرس کے تقرر ہوا۔

میدانِ عمل: والد صاحب اور دونوں بڑے بھائیوں کے انتقال کے بعد خاندان کے معتقدین کے اصرار پر مولانا محمد الیاس نے نظام الدین میں مستقل قیام کر کے خاندانی مسندِ درس سنبھالنے کی ٹھانی۔ مدرسہ نہایت چھوٹا تھا اور نظام الدین درگاہ سے متعلق لوگوں کو چھوڑ کر کوئی آبادی نہ تھی۔ مدرسے کی کوئی ذاتی آمدنی بھی نہ تھی، بعض اوقات جنگلی پھلوں پر گزارے کی نوبت آجاتی تھی لیکن طلبہ کی روحانی تربیت خوب ہو رہی تھی۔ مولانا اس سختی سے ذرا ہراساں نہ تھے البتہ فارغ البالی سے خوفزدہ رہتے۔ مدرسے کی تعمیر اور ظاہری ہیئت سے بھی خطرناک حد تک بے پرواہ تھے کہ اصل چیز تو تعلیم ہے۔ ان کا طریقِ تعلیم جداگانہ تھا آسان اور عام فہم کتابیں داخلِ نصاب تھیں طلبہ کو سمجھانے اور ان کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے نت نئے انداز اختیار کرتے۔

دہلی کے جنوب میں واقع میوات میں جو میو قوم بستی ہے وہ صرف نام کی مسلمان رہ گئی تھی بلکہ کئی علاقوں میں تو نام بھی ہندوانہ ہو گئے تھے۔ مشنریوں اور آریاؤں کے حملے اس پر مستزاد تھے۔ میوؤں کا اصول تھا کہ تہوار ہندو مسلم دونوں مذاہب کے مناؤ اور فرائض کسی ایک کے بھی ادا نہ کرو۔ مولانا الیاس کے نزدیک میوات کی اصلاح کی تدبیر یہ تھی کہ ان میں علم کی روشنی پھیلائی جائے تاکہ جہالت کا اندھیرا دور ہو۔ چنانچہ جب کوئی میوات سے آپ کو درس وغیرہ کے لیے بلاتا تو آپ یہ شرط رکھتے کہ؛ ''میں وہاں تب تک نہ آؤں گا جب تک اصلاح کی کوئی پائیدار شکل نہ پیدا ہو، میں صرف اسی شرط پر چل سکتا ہوں کہ تم وعدہ کرو کہ اپنے ہاں ایک مکتب قائم کرو گے۔'' دو تین مرتبہ لوگ آ آکر لوٹ گئے، آخری مرتبہ لوگوں نے سوچا انھیں لے تو چلا جائے پھر دیکھا جائے گا۔ پہلے سفر میں دس مکاتب کا قیام ہوا، پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا اور کچھ ہی عرصے میں کئی سو مکاتب قائم ہو گئے۔

اس سے حالات میں خوشگوار تبدیلی تو ضرور ہوئی لیکن نتائج اس قدر امید افزا نہ تھے جتنی توقع تھی۔ ماحول کی بے دینی کا اثر طلبہ پر بھی تھا۔ کئی ایک تعلیم پانے کے بعد بھی جاہلی ماحول سے لڑنے کا حوصلہ نہ رکھنے کی وجہ سے اسی میں ضم ہو جاتے۔ اس دوران مولانا الیاس کے میوات کے دورے جاری رہے،

اور وہ کسی پائیدار حل کی تلاش میں غور و فکر کرتے رہے۔ 1926 کو جب مولانا الیاس اپنے دوسرے حج سے لوٹ کر آئے تو ان کا ذہن اصلاح کے ایک طریقۂ کار پر مطمئن ہو چکا تھا۔ آپ نے تبلیغی گشت شروع کیا اور عوام میں نکل کر کلمہ، توحید اور نماز کی طرف لوگوں کو پکارا۔ پھر کچھ گنی چنی جماعتیں بنیں۔ 1933 میں تیسرے حج سے واپسی کے بعد اس کام کی رفتار مزید تیز کر دی۔ مولانا کی دوراندیشی نے بھانپ لیا تھا دنیا کے کھگیڑ میں لوگوں کو وہ یکسوئی نہیں مل سکتی جو دین کے مزاج کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے درکار ہے، سب لوگ مکاتب میں بھرتی بھی نہیں ہو سکتے، اور یہ سوچنا بھی سادہ لوحی ہے کہ صرف تقریریں سن کر ان کی زندگی میں انقلاب آ جائیگا۔ مولانا کے نزدیک عوام کی اصلاح کی صرف یہ تدبیر تھی کہ ان کو کچھ مدت کے لیے دنیا سے کاٹ کر جماعتوں کی شکل میں دین اور علم کے مراکز کی طرف نکلنے پر آمادہ کیا جائے، وہ وہاں کے عوام میں دین کی بنیادی باتوں کی تبلیغ کریں، وہاں کے علماء سے کسبِ فیض کریں اور یوں دین کی حلاوت کو بلا واسطہ محسوس کریں اور واپس آ کر اسی حلاوت کو اپنی روزمرہ زندگیوں کا ایک اٹوٹ حصہ بنالیں۔ پہلی جماعت کے لیے آپ نے اپنے وطن کاندھلہ کا انتخاب فرمایا اس کے بعد تو ہزارہا جماعتیں بنیں جنہوں نے کروڑ ہا قلوب کو ایمان و یقین کی شمعوں سے منور کیا۔

یہ innovative طریقۂ کار میوات میں خاصہ کامیاب رہا۔ جن علاقوں میں کوئی مسجد ڈھونڈھے نہ ملتی تھی ان علاقوں میں قریہ قریہ مساجد و مکاتب کا قیام عمل میں آیا۔ ہندوانہ وضع سے نفرت پیدا ہوئی، بے کہے لوگ داڑھیاں رکھنے لگے اور سود، شراب، قتل و غارتگری، جرائم و بداخلاقی سے تائب ہوئے۔ مولانا کے نزدیک کام کی صحیح ترتیب یہی تھی کہ پہلے لوگوں میں حقیقی ایمان کی قدر اور خوفِ آخرت پیدا کیا جائے تا کہ دین کے لیے دنیا قربان کرنے کا جذبہ ان میں پیدا ہو، اس کے بعد پورے دین کی صلاحیت از خود ان میں پیدا ہو جائے گی۔ جنوری 1938 میں آپ پھر حج پر روانہ ہوئے اور اس دعوت کو عرب میں عام کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ملی۔ میوات کے تجربے کو وہ عالمی پیمانے پر آزمانا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ کوئی شخص دین کے بنیادی علوم سے بے بہرہ نہ رہے پھر انہی میں اہلِ علم و فضل پیدا ہوں۔ مولانا کے نزدیک دین و دنیا الگ الگ نہیں بلکہ دنیا کو صحیح طور سے برتنا ہی دین ہے۔ لیکن ان کے مطابق دنیا کی آلودگیوں میں ڈوبے ہوئے فرد پر از سر نو دین کا رنگ

چڑھانا ایک مشکل کام ہے لہٰذا اسے عارضی طور پر اس کے غیر دینی ماحول سے نکال کر کسی زندہ و بیدار دینی ماحول میں رکھا جائے تا کہ وہ دین کے جلوے کو بے نقاب دیکھ سکے اور جب واپس آئے تو اسی کے مطابق اپنی دنیا نبھائے۔ یہ امکان تھا کہ جماعتوں میں موجود جاہل مبلغین، لاعلمی میں اسلام کے تعلق سے کچھ اناپ شناپ بک جایا کریں، مولانا الیاس نے اس پریشانی کا یہ حل ڈھونڈا کہ مبلغین ان چیزوں کے سوا جن کی انھیں تعلیم دی گئی ہے کسی اور چیز کا ذکر مطلقاً نہ چھیڑیں۔ چنانچہ جماعتوں پر نکلنے والے مبلغین عام طور پر صرف چھ باتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ خود مولانا کی یہی عادت تھی وہ اختلافی مسائل سے بالکل تعرض نہ کرتے تھے۔

نومبر 1941 میں گڑگاؤں میں ایک عظیم الشان جلسے کا انعقاد ہوا، بیس پچیس ہزار لوگوں نے شرکت کی۔ اس کے بعد تو جماعتیں علی گڑھ، آگرہ، میرٹھ، بلند شہر اور دیگر اضلاع یوپی و پنجاب میں جانے لگیں۔ فروری 1943 میں کراچی کے لیے ایک بڑی جماعت نکلی۔

داعیانہ تڑپ: مولانا الیاس مسلمانوں کے آپسی اختلافات سے سخت نالاں تھے۔ مناظرہ ومباحثہ اور ایک دوسرے کی تردید ان کی نظر میں اختلافات کم کرنے کے بجائے بڑھانے کے موجب ہوتے ہیں، لہٰذا اختلافات اسی صورت میں دور ہوسکتے ہیں جب ایک دوسرے کے ساتھ رہا جائے، ایک دوسرے کو سمجھا جائے اور برتا جائے۔ مولانا الیاس کی رائے تھی کہ مسلمانوں کی برائیوں کا انسداد ان کی برائیاں بیان کرنے سے نہیں ہوسکتا بلکہ چاہیے کہ ان میں جو ایک آدھ اچھائی موجود ہو اسکی تکثیر کی جائے؛ برائیاں از خود دور ہوجائیں گی۔ ایک جاہل میواتی سے انھوں نے تبلیغ کے لیے نکلنے کے لیے کہا تو اس نے پوچھا کہ یہ 'تبلید' کیا ہوتی ہے انھوں نے اس سے لوگوں کو کلمہ سکھانے کے لیے کہا تو اس کا جواب تھا کہ اسے کلمہ بھی نہیں آتا ہے، یہ سن کر مولانا الیاس تڑپ کر بولے، ''جاؤ تم لوگوں سے یہی کہو کہ دیکھو میری یہ عمر ہوگئی ہے اور نہ سیکھنے کی وجہ سے مجھے اب تک کلمہ نہیں آتا، جاؤ تم کسی سے کلمہ ضرور سیکھو۔'' تبلیغ کی راہ میں وہ اکثر اپنے ساتھیوں کو للکارا کرتے کہ ''**اس راہ میں اپنا پسینہ بهاؤ اور خون بهانے کے لیے تیار رهو۔**'' وہ جس بات میں دین کا فائدہ نہ دیکھتے اسے تضیع اوقات سمجھتے۔ مجلسوں، حلقۂ درس حتی کہ دستر خوان پر بھی لایعنی گفتگو کو ناپسند فرماتے۔ اس کے بدلے ذکر کی تلقین کیا کرتے تھے۔ واعظوں تک کو مختصر اور جامع باتیں کہنے کا حکم دے رکھا تھا؛ جہاں تقریر میں

لطافت، قصص اور تمثیلات شروع ہوئیں تو فوراً کہتے کہ: مطلب کی بات کہو یا ختم کرو۔ داعیانہ تڑپ ایسی بے مثال تھی کہ راتوں کو چین سے سونا محال تھا۔ بسا اوقات سرد آہیں بھرتے اور فرماتے، ''میرے اللہ! میں کیا کروں کچھ ہوتا نہیں۔'' فرمایا کرتے تھے، ''دین کے فروغ کے لیے جان دینے کے شوق کو زندہ کرنا اور جان کو بے قیمت کر دینا ہی ہماری اس تحریک کا مقصود اور خلاصہ ہے۔'' مولانا ذکر کی اہمیت پر بہت زور دیتے تھے ان کے مطابق ذکر، ذکر لسانی اور ذکر لفظی تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے مختلف احوال اور اعمال کے بارے میں جو احکام وارد ہوئے ہیں دھیان سے ان کے مطابق اپنے اعمال و اشغال کو انجام دینا ذکر ہے۔

وفات: نومبر 1943 کو انھیں ایسی پیچش ہوئی کہ پھر کبھی اچھی نہ ہوئی۔ آپ بہت ضعیف ہو گئے تھے، کمزوری اور نقاہت زوروں پر تھی پھر بھی خود چلتے تھے اور نماز اکثر خود ہی پڑھاتے تھے۔ مارچ 1944 تک ضعف بڑھ گیا تھا؛ باوجود اس کے دو آدمیوں کے سہارے جماعت میں آتے اور کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے۔ اس علالت میں قوت جیسے جیسے گرتی تھی اعلائے کلمۃ اللہ کا جذبہ اسی رفتار سے ترقی پر تھا۔ حتی کہ کچھ اعزہ جب کاندھلہ سے خیریت دریافت کرنے چلے آئے تو فرمایا، ''جو مٹنے کے لیے بنا ہے اس کی خیریت پوچھنے کے لیے کاندھلہ سے یہاں تک آئے ہو اور رسول کریم کا دین عزیز جو مٹنے والا نہیں، مٹا جا رہا ہے اور تم اس کی خبر تک نہیں لیتے۔'' حالت روز بروز نازک ہوتی رہی، آخری دنوں میں نمونیہ بھی ہو گیا تھا۔ آخری شب گھبراہٹ لاحق ہوئی، شب بھر تکبیر کی صدائیں دیتے رہے پھر آنکھ لگی تو ایسی لگی کہ پھر کھل نہ سکی۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کی داعیانہ سوز و تپش سے ہماری روح کو گرما دے۔ آمین!